ڈاکٹر نجیب جمال

ڈین، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

آزاد کی تنقید: ایک جائزہ

Dr. Najeeb Jamal

Dean, Islamia University Bahawalpur

Criticism of Aazad : A Review

Aazad is one of the important prose writers of the Sir Syed era. He is imaginative in his attitude but seem to be very practical in his compositions. He was an exceptional literary historian, a matchless prose writer and an unexampled critic. this articale is an analytical study of his way of criticism in the perspective of his famous book "Aab-e-Hayat" in particula

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰۔۱۹۱۰) [۱] اردو زبان وادب کی تاریخ کا ایک ایسا نام ہے جسے بلا شبہ مجموعۂ کمال قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تصنیف وتالیف میں گزرا۔ عمر کے آخری بیس سالوں میں انھیں جنون ہو گیا تھا مگر ان کا تخلیقی ذہن اپنی شیرازہ بندی میں مصروف رہا۔ [۲] تاریخ سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی اور مغل حکمران اکبر اعظم ان کا ہیرو تھا آنے والی نسلوں پر جس کی جہاں بانی اور فرماں روائی کا سکّہ جمانے کے لیے انھوں نے 'دربار اکبری' کی تالیف کی۔ آزاد نے تاریخ ادب کو بھی موضوع بنایا۔ ''آب حیات'' جیسی یادگار زمانہ کتاب کے علاوہ 'سخن دان فارس' اور 'نگارستان فارس' جیسی کتب اس حوالے سے شہرت عام حاصل کر چکی ہیں۔ 'آب حیات' کو جو قبولیت ملی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اردو کے پہلے باقاعدہ اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کی ادارت میں اپنے والد بزرگوار مولوی محمد باقر [۳] کی معاونت اور استاد ذوق [۴] کی ہمہ وقت صحبت نے آزاد کی فطری صلاحیتوں کو چمکایا۔ جستجو کا مادہ ابتدا ہی سے ودیعت تھا جسے آزاد نے عالم جنوں میں بھی سنبھالے رکھا۔ آزاد کی رنگین بیانی مشہور ہے مگر وہ تحقیق وتنقید کے شوق اور جستجو کے ذوق کی تسکین کرتے رہے ان کی تصانیف میں تاریخ اور تاریخ ادب، لسانیات، تمثیل، قصے، فلسفہ، درسی کتابیں اور نظم، شامل ہیں جو بجائے خود موضوعات کے تنوع کی مثال ہیں۔

آزاد کے نقطہ نظر، ان کی ذاتی یادداشتوں اور ان کی معلومات کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن اپنی تصانیف پر جو محنت اور جان کاہی آزاد کرتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اسی لیے ان کی ریاضت اور محنت کا اندازہ کرنے کے بعد حالی نے ''آبِ حیات'' [۵] جیسی اختلافی کتاب کو ''جامع کتاب'' قرار دیا تھا۔

آبِ حیات تذکرہ بھی ہے اور اردو شاعری کی تاریخ بھی۔ اسے برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی، تمدنی اور ادبی داستان بھی کہا گیا ہے۔ [۶] آبِ حیات شاعری کے مختلف ادوار کو اس طرح سامنے لاتی ہے کہ ان ادوار کی شاعرانہ فضا میں اردو کے نامور شعراء اپنی وضع قطع، لباس، وضع داری،

اخلاق وعادات، اپنی رقابتوں، معاصرانہ چشمکوں اور معرکہ آرائیوں کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ''آبِ حیات'' نہ صرف ہمارے ذوق کی تربیت کرتی ہے بلکہ اسے جلا بھی دیتی ہے۔ آزاد کو مرقع نگاری کے ساتھ واقعہ نگاری میں بھی یدطولی حاصل ہے۔ خصوصاً واقعات کے بیان میں ڈرامائی عناصر کو شامل کر کے وہ ایک عالم حیرت کی تخلیق کرتے ہیں۔ ''آبِ حیات'' میں انشاءاللہ خاں انشاء کا مشاعرے میں شریک ہو کر غزل پڑھنا ڈرامائیت کی عمدہ مثال ہے۔

ان خوبیوں کے باوجود محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد کا تنقیدی شعور رنگینی بیان کے تابع ہے۔ ''آبِ حیات'' کے لسانی وتنقیدی مباحث کے باوجود دلچسپی اور کامیابی کا راز آزاد کی شاعرانہ نثر ہے اگرچہ یہ اسلوب تنقید کے لیے موزوں معلوم نہیں ہوتا تاہم یہ بھی درست ہے کہ شاعرانہ نثر کی وجہ سے شاعرانہ ماحول کی تشکیل میں آزاد کو بے پناہ کامیابی ہوئی ''آبِ حیات'' کے پانچویں باب کا یہ اقتباس دیکھیے:

''دیکھنا وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں۔ اٹھو اٹھو، استقبال کر کے لاؤ
اس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار کو ہماری
آنکھیں ترستی ہیں۔''[۷]

اسی طرح ''سخن دانِ فارس'' آزاد کی ایک اہم کتاب ہے، یہ فارسی ادب کی تاریخ بھی ہے اور تنقید بھی۔ خصوصاً آزاد نے ہند ایرانی تقابلی لسانیات پر سیر حاصل بحث کی ہے، تنقید یہاں بھی اگرچہ ضمنی حیثیت رکھتی ہے لیکن آزاد کے تنقیدی رجحانات زیادہ واضح صورت اختیار کرتے ہیں۔ بالخصوص ان کے بعض تبصرے تو بے پناہ بلاغت کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ جملہ سامانی دور پر بہترین تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے:

''نظم فارسی کی ابھی زبان نہیں کھلی۔''[۸]

سعدی کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیخ سعدی شیریں کلام شاعر ہیں آج تک پھیکے نہیں ہوئے''۔[۹]

حافظ کی غزلوں کو ذہن میں رکھیے اور آزاد کا یہ جملہ ملاحظہ کیجیے:

''ان کے ہاں نہ صنعتوں کی بناوٹ ہے نہ استعاروں کی رنگ آرائی ہے۔
دل کی صفائی ہے زبان سے نکل آئی ہے۔''[۱۰]

آزاد کے تنقیدی شعور پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں ''آبِ حیات''، ''سخن دانِ فارس'' اور ''نگارستان فارس'' میں آزاد کی مرقع اور مرصع نگاری سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس دور کی صورت حال پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔

آزاد کے دور کو مقفیٰ مسجع عبارتوں کے دور اور سائنسی نثر کے دور کی درمیانی کڑی کہنا چاہیے۔ ان کا زمانہ تو مکمل اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتداء کی طرح ''نوطرزِ مرصع''، ''باغ و بہار'' اور ''افسانہ عجائب'' کا ہے اور نہ ہی انیسویں صدی کے آخر کی طرح پورے طور پر سائنٹیفک نثر کا۔ یہ درست ہے کہ ان کے دور میں ''تہذیب الاخلاق'' کی نثر سامنے آ چکی تھی۔ سرسید کی سادگی پسندی کی تحریک ادب میں رائج ہو چکی تھی۔ شبلی بھی بحیثیت سیرت نگار مورّخ کے اپنی تحریریں پیش کر چکے تھے۔ نذیر احمد ابتداء میں معاشرتی قصہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ بعد میں انہوں نے اپنے عہد کی سیاسی وسماجی صورتِ حال کو ''ابن الوقت'' کی شکل میں ناول کا روپ دیا۔ حالی بیک وقت

شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ قصہ نگار بھی ہیں اور سوانح نگار بھی۔ انہوں نے اردو میں پہلی مرتبہ باقاعدہ تنقید نگاری کی، خواتین کے لیے قصّے لکھے اور سوانح نگاری میں تو وہ حرفِ اول ہیں۔ یہ سب اکابرِ ادب، آزاد کے معاصرین میں شامل ہیں۔ آزاد نے جہاں بالواسطہ طور پر سرسید کی تحریک سے اثر قبول کیا وہاں خود انہوں نے اردو میں موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور فطرت، ماحول اور زمین کو موضوع بنا کر نظمیں لکھیں۔ یہی نہیں، نظم جدید کی حمایت میں لیکچر دیے[۱۱] اپنی نظموں کے مجموعے کا دیباچہ قلم بند کیا اور شاعری کے مستقبل پر بحث کی۔ حالی اپنے قیام لاہور کے دوران آزاد کے افکار و تصورات سے متاثر ہوئے۔ ان کی نظم گوئی انہی اثرات کا ثمر ہے۔

اب ایک طرف تو سادہ گوئی کا غلغلہ تھا دوسری طرف طرز کہن کی پیروی کی جا رہی تھی۔ اسی زمانے میں ''اودھ پنچ'' لکھنؤ کی مرصع تحریریں اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی مسجع و مقفّیٰ ''فسانہ آزاد'' بھی لکھی جا چکی تھی اور اس کا بڑا شہرہ تھا۔ خود غالب، جنھوں نے اپنے خطوط میں سادہ نویسی کو فروغ دیا تھا، نے ''مہر نیم روز'' لکھی تو مشکل پسند ہی ثابت ہوئے۔

آزاد کی تحریریں مذکورہ بالا دو عہدوں کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کی کتاب 'آبِ حیات' نئے اور پرانے اسلوب کا سنگم ہے۔ آزاد کو ہم آدھا نیا اور آدھا پرانا کہہ سکتے ہیں۔ عبارتوں کی شوخی، علم بیان کا استعمال اور تحریر کی سجع بندی کا عمل انھیں پرانا بناتا ہے تو بیان کی خوبی اور صفائی، تجزیہ اور تنقید ان کی تحریروں کو نیا ثابت کرتی ہے۔ دراصل انیسویں صدی کے آخر میں مغربی علوم کے تراجم اور مغربی ادب کے موضوعات نے جہاں اردو نظم و نثر کے موضوعات کو بدلنے کی کوشش کی وہاں اسلوب کی تبدیلی پر بھی اردو والوں کو آمادہ کیا۔ آزاد نے لاہور میں کرنل ہالرائیڈ [۱۲] کی صحبت میں رہ کر ان تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ انجمن پنجاب[۱۳] کے مشاعروں کا آغاز کر کے وہ خود بھی اس تبدیلی کے موید بن گئے تھے۔ تاہم آزاد نے ذہنی تربیت کے لیے جو ماحول پایا تھا وہ سراسر مشرقی تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شاعرانہ تھا۔ شاعری کے قدیمی مراکز ''مکتب آزردہ و ذوق'' میں انھوں نے معنوی تربیت حاصل کی تھی۔

حاصل اظہار کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد کا زمانہ نئی اور پرانی تحریروں کی ترکیب کا زمانہ ہے۔ اسے ہم مشرق اور مغرب کے طرز فکر و اظہار کے امتزاج، (CO-RELATIONSHIP) کا زمانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں زمانوں کا سنگم ہے۔ یعنی انیسویں صدی بیسویں صدی سے گلے مل رہی ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں مغربی افکار بالخصوص نصاب کے ذریعے برصغیر میں داخل ہوئے اور علمی تحریک کا حصہ بن گئے۔ یہ تحریک ابتداء میں سرسید کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ آزاد اگرچہ سرسید سے دور بیٹھے تھے تاہم وہ اس تحریک سے متاثر ضرور ہوئے۔

آزاد کا موضوع تاریخ اور تاریخ ادب ہے۔ سرسید کے رفقاء میں شبلی کی تحریروں کا موضوع بھی تاریخ اور تاریخ ادب ہے۔ لیکن ان کے یہاں استدلال پایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی تحریریں سائنٹیفک ہیں۔ آزاد نے اس دور سے جتنا اثر قبول کرنا تھا کیا، مگر انہوں نے تاریخ کو ادبی رنگ میں لکھا۔ آزاد کی تحریروں میں شبلی، حالی اور سرسید کی طرح سائنٹیفک انداز نہیں ہے۔ ان پر الزام ہے کہ:

(۱) وہ تخیلی (IMAGINATIVE) ہیں۔

(۲) ان کی توجہ موضوع سے زیادہ اظہار پر ہوتی ہے۔

(۳) عبارت کی آرائش ان کا طرۂ امتیاز ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریریں ادبی معیار کی حامل ہونے کے باوجود علمی، تحقیقی اور تنقیدی معیار سے کم تر ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود آزاد کی اہمیت اس میں ہے کہ انھوں نے اس دور میں ادبی تاریخیں لکھیں جب ان کا رواج نہ تھا۔شعراء کے تذکرے تو تھے لیکن آزاد کی تذکرہ نویسی کئی اعتبار سے بہتر تھی۔تاہم یہ درست ہے کہ ان کی تحریریں استدلالی نہیں ہیں بلکہ ان پر آزاد کی ذاتی پسند و ناپسند کی گہری چھاپ ہے۔یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریریں تاثراتی (طرف دارانہ) ہیں اور تصویر کے ایک رخ کو پیش کرتی ہیں۔آزاد کی توجہ واقعہ کی حقیقت سے زیادہ واقعہ کے تصویری اظہار پر رہتی ہے اس لیے وہ محقق یا نقاد کم تر اور مرقع نویس برتر ہیں۔

آزاد کی رنگینی عبارت کے وصف نے ان کی تحریروں کو استعاراتی بنا دیا ہے اور وہ تمثیل، رمز اور کنائے کے پیرائے میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔آزاد کی تحریروں کو ہم ادبی تنقید کے جس خانے میں رکھتے ہیں اسے اصطلاح میں 'تاثراتی تنقید' کہا جاتا ہے۔بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آزاد تک جتنے تنقیدی نقوش (تذکروں میں) ملتے ہیں خواہ وہ کسی شخصیت، عہد اور تخلیق کے بارے میں منفی رویہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں سب کے سب تاثراتی (IMPRESSIONISTIC) نوعیت کے حامل ہیں۔تنقید کی اس شاخ کا جسے تاثراتی تنقید کہتے ہیں رومانوی اور جمالیاتی اظہار سے واضح تعلق قائم ہے۔اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آزاد کی تحریریں تاثراتی ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کا اسلوبِ تحریر جمالیاتی ہے۔ان کی تنقید مکمل طور پر رومانوی نہ سہی لیکن تاثراتی تنقید رومانوی طرزِ اظہار ہی کی ایک صورت ہے اور آزاد کی تنقیدی کتاب ''آبِ حیات'' اسی اسلوب کا دلکش نمونہ ہے۔

اردو میں تاثراتی تنقید کا رواج ابتدائی عہدِ تنقید سے ہے۔اردو تنقید کا آغاز تذکروں سے ہوا جو شروع شروع میں تو فارسی میں لکھے گئے لیکن بعد میں ''آبِ حیات'' کی طرح اردو میں لکھے جانے لگے۔آزاد بھی ذہنی طور پر تاثراتی تنقید کے نمائندہ ہیں۔تاثراتی یا ارتصامی تنقید (impressionistic criticism) مشرقی وضع داری اور مشرقی اقدار سے قریب تر ہے۔چنانچہ مشرقی مزاج کے حوالے سے آزاد کی تنقید میں درج ذیل ذہنی عناصر کا بہت دخل ہے۔

۱۔ وضع داری کی راہ سے ادب میں طرف داری کو برقرار رکھنا۔

۲۔ اظہار کے رویئے کو سخت نہ ہونے دینا۔

۳۔ رنگینی بیان، لہجے کی گھلاوٹ اور اظہار کی ملاحت سے کام لینا گویا عیوب کے اظہار میں کم کم شدت کا اظہار اور خوبیوں کے اظہار کے لیے شدید مبالغے کا رویہ اپنانا۔

۴۔ حسن ظاہر پر توجہ مرکوز رکھنا اور عموماً داخلی حقائق سے صرفِ نظر کرنا یعنی کسی تخلیق کی دیر پائی اور باطنی محاسن کو ثانوی حیثیت دینا۔

۵۔ روایتی وضع داری سے انحراف کی صورت میں کبھی کبھی حد درجہ تاثراتی ہو جانا، معقولات کو چھوڑ کر جذباتی رویہ اختیار کرنا اور عام تاثر یا ذاتی پسند کی بناء پر کسی تخلیق یا شخص کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کرنا۔

مجموعی طور پر ہماری تنقیدی روایت اور انفرادی طور پر آزاد کا تنقیدی مزاج مندرجہ بالا عناصر سے مرتب ہوتا ہے۔

آزاد انیسویں صدی کے آخر میں ایک ایسے نقاد ہیں جنہیں مکمل طور پر نہ نئے تنقید نگاروں نے قبول کیا اور نہ ان کا سلسلہ پرانے تنقیدی رویوں سے ہی قائم ہو سکا۔حالی، آزاد کے معاصر ہیں اور تنقید میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔وہ مکمل طور پر مغرب کے تنقیدی اصولوں کے حامی ہیں اور استدلال کو بنیاد بناتے ہیں، جب کہ آزاد کے یہاں استدلال بہت کمزور ہے۔وہ اپنے استادِ ذوق کو غالب پر ترجیح دیتے ہیں

اور مومن کو سرے سے درخورِ اعتنا نہیں جانتے۔ یہ غیر استدلالی (NON-ARGUMENTATIVE) انداز ہے۔ آزاد کی تحریروں کے بارے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریریں مشرقی عبارت آرائی اور مشرقی آرائش بیان کی نمائندہ ہیں تو ہمارے ذہن میں فوراً ''آبِ حیات'' ابھرتی ہے۔ آزاد کا تعلق تنقید میں ادبی جمالیات کے مکتب (SCHOOL OF LITERARY AESTHETIC) سے قائم ہوتا ہے۔ گویا ہم آزاد کی تنقید کو ادبی تنقید (LITERARY CRITICISM) کہہ سکتے ہیں وہ تنقید میں ارتصامی مکتبہ فکر (IMPERSSIONISTIC SCHOOL OF CRITICISM) کے نمائندہ ہیں۔ اگرچہ جمالیاتی تنقید قدرے سائنٹفک ہے لیکن یک رخی اور جانب دارانہ ہے۔ آزاد کی تنقید اسی رویے کی ترجمان ہے۔

آزاد کا زمانہ نصف قدیم ہے اور نصف جدید۔ تذکروں کا قدیم اسلوب تحریروں کی لہلہاوٹ اور اسلوب کے بھڑکیلے پن سے عبارت تھا۔ یہ وہی بھڑکیلا پن ہے جسے لان جائنس نے 'ایشیاوالوں کا وصف' قرار دیا ہے۔[۱۴] رنگینی، پرکاری، شوخی، حسن، ترصیع، ترتیب، تزئین اور تصویر کاری اس اسلوب کی ذیلی خصوصیات ہیں۔ یہ اسٹائل ایشیا میں اور خصوصاً برصغیر میں بہت مقبول تھا اور اسی اسٹائل کی بھرپور نمود آزاد کے یہاں ہوتی ہے۔ انکے اسلوب کا تاثراتی لہجہ جس میں طرف داریوں اور رائے زنی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ایسا ہے جس میں بیان کی گئی روایتوں اور واقعات کو ہم بغیر دلیل کے سمجھتے ہیں۔ دراصل آزاد سے پہلے سیاسی وسماجی شعور، اقتصادی وتہذیبی تناظر اور اجتماعی وشخصی رجحانات کے حوالے سے ادب کا مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ آزاد کے دور میں یہ تحریک شروع ہو چکی تھی کہ ادب کا مطالعہ سیاسی وسماجی، اقتصادی وتہذیبی اور اجتماعی وشخصی پس منظر میں کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے آزاد پرانے زمانے کو رخصت کرتے ہوئے اور نئے زمانے کا استقبال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تذکروں کی مثال لیجیے، آزاد سے پہلے تذکروں میں شاعروں کا تذکرہ بہ اعتبار حروفِ تہجی ہوتا تھا جس کی وجہ سے ہمارا ذہن روایت کا پابند ہو کر رہ گیا اور مطالعے کا ایک معیار قائم نہ ہو سکا۔ آزاد نے ''آبِ حیات'' میں جدت یہ کی کہ شاعروں کو ان کے مخصوص زمانوں میں رکھا۔ انتخاب سے کام لیا۔ کم تر درجے کے شاعروں کی درجہ بندی کی اور شاعروں کو پانچ مختلف درجات (CATAGORIES) میں تقسیم کیا۔ درجہ بندی کا یہ طریقہ آزاد کا سائنٹیفک انداز ہے۔

آزاد اردو کے ان چند گنے چنے نقادوں میں سے ہیں جو تنقید میں بھی امتیاز رکھتے ہیں اور اسلوب تنقید میں بھی ایک خاص وصف کے حامل ہیں۔ آزاد ایک صاحب طرز انشاپرداز کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ نقاد سے زیادہ انشاپرداز تھے اس اعتبار سے انشاپردازی کا تنقید میں برقرار رکھنا اور تنقید کے معیار کو بھی قائم رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔ آزاد کا اسلوب تو ایسا ہے جس میں ناقابلِ تقلید انفرادیت کے ساتھ ساتھ مخصوص محاکاتی عمل اور رنگینی ادا بھی ہے۔ ان کی اس تحریری خصوصیت میں کوئی اور ان کا شریک نہیں۔ وہ خود ہی اس کے موجد ہیں اور خود ہی منتہی۔ اس ناقابلِ تقلید اسلوب کی امتیازی خصوصیات کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ آزاد اوّلاً مرقع نگار ہیں۔ ان کی مرقع نگاری کے کئی پہلو ہیں، ان میں شخصیت کی قدآدم تصویر (بمعہ حلیہ) بنانا، واقعات کی منظر کشی اور تخیلات کی مصوری شامل ہیں۔ تخیل کی مصوری کا عمل مرقع نگاری کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ وہ بڑی خوبی ہے جو آزاد کے جادو نگار قلم اور سحر انگیز بیان کو حاصل ہے۔ ان کا تخیل اتنے خوبصورت مرقعے بناتا ہے کہ نقل بھی ہو تو اصل معلوم ہونے لگے۔ بقول انیس:

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

۲۔ ناپید کو پیدا کر دکھانا اور نامعلوم کو معلوم بنا دینے کی صلاحیت آزاد کا مسلمہ ہنر ہے۔ اس ہنر نے ان کو نقصان بھی بہت پہنچایا ہے۔ یعنی ان کی حقیقت نگاری پر شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ بھی کہیں آزاد کی سحر بیانی نہ ہو۔ وہ اس داستان گو کی طرح معلوم ہوتے ہیں جو حد درجہ فرضی اور خیالی قصے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے بیان کی رنگینی اور لطف میں تحیّر اور تعجب کے عناصر شامل کر دیتا ہے۔

۳۔ آزاد نے اپنی تحریروں میں ڈرامے کی خصوصیت کو برتا ہے۔ نثر میں ڈرامائیت پیدا کرنا کوئی مشکل ہنر نہیں لیکن تنقید کے عمل تحریر میں اور تاریخ نویسی کے مرحلے میں اسلوب کی اس تماشا گری کو بروئے کار لانا بہت زیادہ کٹھن بھی ہے اور بظاہر نامناسب بھی۔ لیکن آزاد نے اپنی تنقید (آبِ حیات) کو ادبی حسن کے ان تماشوں سے بھر دیا ہے اور اپنی تاریخ نویسی (دربارِ اکبری) کو تخیل کی خوبیوں سے بدرجہ کمال آراستہ کیا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جس کے ذریعے ان کی تحریریں تنقید اور تاریخ جیسے غیر دل چسپ موضوعات کو بھی دلکش اور دل چسپ بنا دیتی ہے گویا آزاد نے تنقید اور تاریخ کو بھی تمثیل بنا دیا ہے۔

۴۔ آزاد کے اسلوب کی ایک خصوصیت خطیبانہ اظہار ہے جسے کام میں لاتے ہوئے وہ مختلف مقامات پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے قاری کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ انہیں اس وقت یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ آنے والے زمانوں کا قاری بھی انکے لہجے پر کان دھرے ان کی باتوں کو سن رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ مکالمے کی راہ سے اس قدر نزدیک سرک آتے ہیں کہ ہمارے روبرو خود کلامی کرنے لگتے ہیں۔ مکالمے کی یہ خوبی ان کی تحریروں کی روح ہے۔

۵۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تحریروں کے اتنے بہت سے قابلِ لحاظ محاسن کے باوجود آزاد کے تنقیدی مباحث کی خامیاں کون کون سی ہیں۔ پہلا سنگ گراں جو آزاد کی راہ میں حائل دکھائی دیتا ہے یہ ہے کہ انہوں نے تنقید کو تنقید سمجھ کر نہیں لکھا بلکہ اپنے تاثرات، اپنے تصورات اور اپنے تعصّبات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ تحریر میں اپنی پسند و ناپسند کا واضح اظہار تنقید کی خوبی نہیں بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ پورے عہد کا زاویہ نگاہ کیا ہے۔ محض کچھ انفرادی خوبیاں پورے سماج کے تاثر کے مقابل اہمیت نہیں رکھتیں۔ کسی شخص کو اچھا سمجھنا خواہ تمام لوگ اسے برا سمجھتے ہوں یا کسی شخص کو برا سمجھنا خواہ اس میں اچھائیاں بھی موجود ہوں تنقید نہیں ہے تعصب ہے۔

آزاد کی تنقید کی ایک خامی یہ ہے کہ ان کی عبارت آرائی نے تنقید کو انشا پردازی بنا دیا ہے۔ وہ موضوع کی کمیت اور کیفیت کو نظر انداز کر کے اسے محض خوبصورت اظہار کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں اور یہ معاملہ تنقید کے معیار کے مطابق نہیں۔

آزاد کا بنیادی موضوع چونکہ تاریخ ادب ہے، اس لیے وہ بیانیہ کو اہمیت دیتے ہیں لیکن ان کی تحریریں داستان گوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ان کی تنقید علمی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی تجزیوں کے دائرے سے نکل کر شاعرانہ نثر کا روپ دھار لیتی ہے۔ رام بابو سکسینہ کے لفظوں میں:

''ان کی نثر بھی اس قدر دل چسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے۔''[۱۵]

آزاد نے تاریخ اور تنقید کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔ متخیلہ کے بہت زیادہ صرفے سے ان کی تنقیدیں ٹھوس نہیں رہ سکیں اور وہ نیرنگِ حقائق کے مقابلے میں نیرنگِ خیال بن گئی ہیں۔ ان کے یہاں حقیقیت کم اور افسانویت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح مواد (MATTER) کم اور آرائش (DECORATION) زیادہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آزاد کی تنقیدی حیثیت کو حالی کی ناقدانہ صلاحیتوں اور ان کے تجزیاتی اور تنقیدی اسلوب نے ماند کر دیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ محمد حسین آزاد ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ بمطابق ۱۰ جون ۱۸۳۰ء بروز جمعرات دہلی میں پیدا ہوئے: اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف (حصہ اوّل)، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۱ عالم جنوں ہی میں آزاد نے ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو شب عاشور میں انتقال کیا۔ ان بیس سالوں میں آزاد نے نو اسی (۸۹) رسالے لکھے جن میں سے اکثر ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے مضمون ''اردو کا پہلا صحافی'' میں لکھا ہے کہ ''یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شمالی ہند میں اردو صحافت نگاری کا آغاز مولوی محمد باقر سے ہوا۔'' بہ حوالہ 'ماہ نو'، لاہور (جلد اوّل) چالیس سالہ مخزن، ادارہ مطبوعات پاکستان اگست ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۴۷ مولوی محمد باقر دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر ان کے دوستوں میں سے تھے انھی سے مولوی محمد باقر نے کالج میں بے مصرف پڑے ہوئے پریس کو خریدا اور 'دہلی اردو اخبار' جاری کر دیا۔ یہ شعراء کا کلام بھی شائع کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی یورش میں مولوی محمد باقر نے مسٹر ٹیلر کو اپنے امام باڑے کے تہہ خانے میں چھپائے رکھا مگر محلے میں یہ خبر عام ہوگئی اور انہیں مجبوراً مسٹر ٹیلر کو ہندوستانی لباس میں رخصت کرنا پڑا تاہم لوگوں نے پہچان کر انھیں ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اسی جرم کی سزا کے طور پر مولوی محمد باقر کو پھانسی دی گئی۔

۴۔ مولوی محمد باقر اور استاد ذوق میں بھی گہرے دوستانہ مراسم تھے جس کے سبب آزاد کو ذوق کی صحبت میسر آئی جس نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی آزاد نے بھی ساری عمر اس تعلق کو نبھایا اور 'آب حیات' میں ذوق کو غالبا اور مومن پر فوقیت دی اس کے علاوہ انہوں نے ذوق کا دیوان بھی مرتب کیا اور اسے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں شائع کیا۔

۵۔ ''آبِ حیات'' پہلی بار لاہور سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ ابرار عبدالسلام (مرتب)؛ ''آبِ حیات''، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص vii

۷۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۸۔ آزاد، محمد حسین، ''سخن دانِ فارس''، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص

۹۔ ایضاً، ص ۳۵۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۵۷

۱۱۔ اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے سرکاری سکولوں کے نصاب میں زیادہ سے زیادہ نظمیں شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ کرنل ہالرائیڈ نے آزاد کو اس سلسلے میں ایک تحریک چلانے پر ابھارا۔ آزاد نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے نظم کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور نظم جدید کی حمایت میں لیکچر دیئے۔

۱۲۔ کرنل ہالرائیڈ اس وقت پنجاب کے ناظم تعلیمات تھے اور آزاد کو ان کی صحبت اور رہنمائی میسر تھی۔

۱۳۔ انجمن پنجاب ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی۔ اس کا ابتدائی نام ''انجمن اشاعت مفیدہ عام پنجاب'' رکھا گیا مگر بعد میں صرف انجمن پنجاب رہ گیا۔ آزاد اس کے سرگرم رکن تھے۔ اس کا مقصد پانچ زبانوں، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور اردو میں علوم وادب کی

ترویج واشاعت تھا۔ ۱۸۶۷ء میں ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج ،لاہور کی سفارش پر آزاد کو انجمن پنجاب کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔انجمن پنجاب سے وابستگی کے نتیجے میں آزاد نے ادبی اور ثقافتی موضوعات پر مضامین کے علاوہ سائنسی ،سماجی اور علمی موضوعات پر بھی مضامین لکھے۔

۱۴؎ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت اوّل، ۱۹۷۵ء،

۱۵؎ سکسینہ، رام بابو، ''تاریخ ادب اُردو''، مترجمہ: مرزا محمد عسکری، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، سن ندارد، ص ۳۶۸